ڈاکٹر مجروح رشید

نظم ''محاورہ مابین خدا و انسان''

ایک تاثر

شعر کے تعلق سے اقبال کا نظریہ بنیادی طور پر ایک افادی نظریہ ہے۔ وہ جہاں شعر کو جمالیاتی مسرت کا سامان سمجھتے ہیں وہاں ان کا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ شعر اپنی حتمی صورت میں انسان کو زندگی کرنے کا ہنر سکھانے کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب و تربیت بھی کرتا ہے اور اسے انسانیت کے اعلیٰ آداب سے بھی آشنا کرتا ہے۔

اقبال نے یہی تصورات عزیز رکھتے ہوئے اپنی شعری دنیا آباد کی ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے احساسات و خیالات کو روایتی اسالیب میں پیش کیا وہاں شعر کے موتی کو پانے کے لئے ہیئتی تجربے بھی کئے۔ انہوں نے نہ صرف خود کلامی کے دھیمے اور نرم لہجے اور تخاطب کی شعلہ بیانی سے گلستانِ سخن میں اپنی آواز کی پہچان بنائی بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے جوہر اس ہیئت میں بھی دکھائے جسکو ہم ایلیٹ کی زبان میں شاعری کی تیسری آواز کہتے ہیں یعنی اقبال نے شعر کہنے کے لئے ان تمام ہیئتی وسائل سے استفادہ کیا جو ان کی واقفیت میں تھے اور جن کو انہوں نے اکثر موقعوں پر بڑی خوبصورتی

سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے برتا ہے ۔ انہوں نے تیسری آواز میں بہت اچھی نظمیں کہی ہیں جو ہماری توجہ کو اپنی طرف بار بار مبذول کرتی رہیں گی ۔

خدا اور انسان کے موضوعات سے متعلق تمثیلی اور تخلیقی سطح پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ایسے موضوعات سے متعلق ہر نظم فن پارہ نہیں بن پائی ہے ۔ خدا، انسان اور انسانیت اقبال کے اہم ترین موضوع رہے ہیں جن پر اقبال نے کئی نظمیں کہی ہیں اور بہت خوب کہی ہیں ۔ خوب اس لئے کہہ پائے ہیں کہ وہ بہرحال ایک بڑے شاعر تھے ۔ ہر بڑے شاعر کی طرح انہوں نے بھی زبان و بیان، مخصوص لب و لہجے اور منفرد اسلوب سے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن پر فارسی اور اردو دونوں زبانیں بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں ۔ موضوع کی اہمیت کبھی بھی کسی نظم کی کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتی ۔ خدا، انسان اور ان کے تعلق سے موضوعات پر اقبال کی ہر نظم کو کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی ان کمزور نظموں کو بھی اردو کے کچھ ناقدین نے عظیم شعری تخلیقات کے طور پر پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی ایک فارسی نظم محاورہ مابین خدا وانسان کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ۔ شاعری کا معمولی طالب علم بھی کلام اقبال کی اس خصوصیت سے واقف ہو گا کہ خدا جہاں اقبال کے ہاں مختلف صورتوں میں جلوہ نما ہے وہاں انسان بھی اپنی گوناگوں اور رنگارنگ تصویروں میں ابھرتا ہے ۔ میں اس وقت اقبال کے تصور خدا و انسان کی بحث سے قطع نظر ان کی نظم کے فنی پہلو پر ایک تاثر پیش کر رہا ہوں ۔

محاورہ مابین خدا و انسان

— خدا —

جہاں را زیک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

— انسان —

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — حیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

محاورہ مابین خدا و انسان ہئیتی اعتبار سے ایک ڈرامائی نظم دکھائی دیتی ہے کیونکہ ایک تو یہ بات نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہے اور دوسرا یہ کہ اقبال نے اپنے جذبات و احساسات کو دو مختلف کرداروں کے عمل اور ردعمل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظم واقعی ایک ڈرامائی نظم بن گئی ہے اگر ایسا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس میں ڈرامائی صورت حال پیدا ہو پاتی ہے اور یہ کہ کیا نظم کے دونوں کردار بھرپور انداز میں ابھر سکے ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کیا نظم کے کرداروں میں ہونے والا مکالمہ اور ان کی سوچ کوئی ایسا تصادم اور تناؤ برپا کرتے ہیں جن میں قاری اپنے تمام تعصبات کو بھول کر شامل ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ دونوں کرداروں کی نفسیات کس طرح کام کرتی ہے اس تصادم میں ان کرداروں کے دفاع کی صورت کیا ہے لیکن اگر شاعر نظم میں کرداروں کو باہم متصادم اور مضبوط

شخصیتوں کی صورت میں پیش کرنے میں ناکام رہا ہے تو پھر ہمیں یہ بھی جاننا ہوگا کہ وہ کون سی کوتاہیاں ہیں جو نظم کی کمزوری کا باعث بنی ہیں۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اقبال نے ڈرامائی آواز میں بہت نادر نظمیں کہی ہیں لیکن ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اقبال نے بعض موقعوں پر اس تکنیک سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ ایسا اسلئے ہوا ہے کہ اقبال نے اپنے تخلیقی کرداروں پر اپنی ذاتی فکر impose کی ہے یا یوں کہیئے کہ اقبال نے ایسے موقعوں پر مذکورہ نظموں کے کرداروں سے ان کی خود مختاری چھین لی ہے۔

"محاورہ مابین خدا و انسان" میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ نظم ایک ڈرامائی صورت حال پیدا کرنے کے بجائے ایک Melodrama بن گئی ہے۔ یہ بات طے ہے کہ ڈرامائی نظم میں بقول ایلیٹ شاعر کی ہمدردیاں منقسم رہتی ہیں اور ہر کردار کو ابھرنے اور پھلنے پھولنے کے ساتھ ساتھ اپنا دفاع کرنے کا بھرپور اور غیر جانب دارانہ موقعہ ملتا ہے لیکن یہ نظم پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی ہمدردیاں کچھ اس طرح سے منقسم ہوتی ہیں کہ کرداروں کی شخصیتیں بھرپور انداز میں ابھر نہیں پاتی ہیں۔ نظم کے پہلے کردار (یعنی خدا) کے مقابلے میں دوسرا کردار (یعنی انسان) بہت کمزور ہے۔ میں مانتا ہوں کہ خدا کی بالادستی قائم و دائم ہے لیکن اگر اقبال کو دو کرداروں کے درمیان مکالمہ کرانے کی کوئی تخلیقی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اس مکالمے کا dispassionate جائزہ لیں۔ شاعر خدا کے جلال و جمال سے اس قدر مرعوب دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس کی طرف داری کرنے لگتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ نظم

کے پہلے کردار یعنی خدا کو پیش کرنا دشوار ہے لیکن نظم کا دوسرا کردار یعنی انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ ابھر سکتا تھا۔ یہ اکیلی نظم نہیں جس میں اقبال نے انسان کو اللہ سے ہم کلام کروایا ہے۔ شکوہ میں انسان = مسلمان خدا سے سر اٹھا کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ یہی نہیں آپ جبریل اور ابلیس والی نظم یاد کیجئے آپ محسوس کریں گے کہ نظم بہت حد تک ڈرامائیت سے بھرپور ہے یا ڈرامائی صورت حال پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اقبال کی کئی نظموں میں آدم یا انسان کا کردار اس قدر جاذب نظر بن جاتا ہے کہ کائنات کی تمام رعنائیوں میں خدا کے بعد اسی کا وجود چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

محاورہ مابین خدا و انسان نظم کا دوسرا کردار (انسان) پہلے کردار (خدا) کے سوالات جنہیں ہم طعنوں سے بھی موسوم کر سکتے ہیں کا جواب دینے کے بجائے ان کو ٹالتا ہے اور بظاہر اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے اپنی مثبت صلاحیتوں کا ذکر چھیڑتا ہے اور یوں خدا کو مطمئن کرنے یا اس کے سوالوں کی چبھن کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

خدا کہتا ہے:

جہاں را زیک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

تو انسان زیادہ Responsive اور Reactive ہونے کے برعکس مصلحت آمیز لہجہ اختیار کرتا ہے اور یوں خدا کے لگائے ہوئے الزام کی بین السطور تصدیق کرتا ہے۔ خدا کا طعنہ یہ ہے کہ میں نے دنیا کو ایک ہی آب و گل سے تعمیر کیا تھا اور تم نے کہیں ایران کہیں تاتار اور کہیں حبشہ بسایا۔ لیکن انسان اس کے جواب میں کہتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بھلا یہ شعر کیسے اس طعنہ کا جواب ہو سکتا ہے ؟

یوں لگتا ہے کہ انسان اللہ میاں کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر خود کو سنبھال نہیں پاتا ۔ برعکس اسکے کہ وہ خدا سے یہ کہتا ہے کہ میں نے ایران تاتار اور حبشہ کیوں بسائے وہ اللہ کے محتسبانہ رویے کو ٹال کر اپنی کارکردگی کی فضیلت اور شان جتانے میں ہی عافیت سمجھتا ہے ۔ اقبال کی شاعری میں بعض موقعوں پر انسان اور خدا کے درمیان محسوس یا غیر محسوس مکالمے میں انسان کی جانب سے پوائنٹ کا جواب پتھر سے دیے جانے کا منظر دکھائی دیتا ہے لیکن اس مکالمے میں وہ صورت نہیں ملتی ۔ وہ خدا سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر پاتا بلکہ خدا سے یہ کہنے کی کوشش کرتا ہے کہ حضور ان باتوں کو چھوڑیئے آپ میری اس صلاحیت کو ملاحظہ فرمائیں جنکی بدولت یہ دنیا باغ و بہار بن گئی ۔

پوری نظم پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ خدا انسان کو تخریب کار گردانتا ہے اور انسان اپنے آپ کو تخلیق کار منوانے کے لئے جتن کرتا ہے لیکن یہ چیز ڈرامائی صورت اختیار نہیں کر پاتی ہے ۔ نظم کا دوسرا کردار Receiving end پر ہے اسلئے ڈرامائیت شدت کے ساتھ ابھر نہیں پاتی ہے ۔ نظم میں کوئی نادر ترکیب یا کوئی ایسا زبردست Expression بھی نظر نہیں آتا جس پر ہماری نظر ٹھہر جاتی ۔ دوسرے کردار (انسان) کے پہلے مکالمے کی بازگشت بعد کے تمام اشعار میں محسوس کی جاسکتی ہے یہ جذبے کا Extension نہیں بلکہ اس کی تکرار ہے ۔ پہلے مصرعے میں جو بات کہی گئی ہے بعد کے مصرعوں میں اسکی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ۔

شب کے لئے چراغ بنانا کسی حد تک قائل کرنے والا بیان ہے لیکن مٹی

سے پیالہ، پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشین بنانے کے عمل میں خالق کائنات کے تخلیقی جوہر کا اعتراف موجود ہے اور اس کی اولیت کا اعلان خود ان مصرعوں سے مترشح ہے۔ اس سے ایک بار پھر اس دعوے کی توثیق ہوتی ہے کہ انسان کا ردعمل کمزور جھینپا سا اور اس کا مکالمہ نہایت بودا ہے۔ من آنم جس شینی کا اعلانیہ ہے وہ شینی ہی رہ جاتی ہے اسلئے کہ "از" کا لفظ بنیادی source کی اہمیت و اوّلیت کی طرف اشارہ ہے۔

اردو تنقید میں اس نظم کو ایجاز و بلاغت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ نظم اور خصوصاً نظم کا دوسرا حصہ نہ بلیغ ہے اور نہ ایجاز و اختصار سے مملو۔ یہ مختصر نظم ضرور ہے لیکن اظہار کے اختصار کی حامل نہیں۔